

نشیب ۲۰۰۰

دوست کبھی کبھار اُس سے ملنے یا کوئی کام نکلوانے آتے رہتے تھے۔ ان کی شادیاں ہوئیں، بچے ہوئے، پھر مصطفیٰ اسن پیسٹھ کی جنگ میں ہلاک ہو گیا وہ افسوس کے لیے اس کے گھر تک نہیں جاسکا، صرف خط پر گزارہ کر لیا۔ اقبال بیمار پڑ گیا۔ آفتاب نے اسے لاہور بلوایا اور مل ملا کر اُسے میوہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ مگر ان بیس برسوں میں وہ ایک بار بھی ساٹھ ستر میل کا یہ فاصلہ طے نہ کر پایا تھا۔ اب وہ کیسے اُس چوراہے میں جا کر کھڑا ہو؟ ہوٹل کے اس ایک کمرے نے حقیقت اُس پر واضح کر دی تھی۔ وہ اس شہر سے جا چکا تھا۔

”ابو۔۔“ اُس کے بیٹے کی سوئی ہوئی آواز آئی۔

آفتاب نے مڑ کر دیکھا۔ ”جاگ گئے ہو؟“

”عمران کے ابو نے نئی کرسی خریدی ہے۔“

”اچھا؟ کیسی کرسی ہے؟“

”وہ گھومنی ہے۔“

”اچھا۔“

ابھی اس بات کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے۔ کل شام کو فاروق اور عمران اُن کے باغچے میں کھیل رہے تھے۔ آفتاب نہادھو کر باہر نکل آیا تھا اور کرسی پر بیٹھا ایک کبیس کی برلیف کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ نسرتین اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھی ایک رسالہ پڑھ رہی تھی۔ آفتاب نے پاؤں چپلی سے نکال کر آہستہ سے زمین پر رکھ دیے۔ گھاس کی نرم نرم ٹھنڈک اُس کے تلووں کو آرام پہنچانے لگی۔ پڑھنے پڑھتے اُس نے بے خیالی سے سر اٹھا کر دیکھا تو اُس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔ اُس ایک لمحے کی یہ ساری بات تھی۔ اُس کا دماغ وقت کے ایک نقطے پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نقطے کے اندر بہت سی باتیں ایک ساتھ تیزی سے ایک دوسری کے گرد گھومنے لگیں۔ آج اُنیس جون تھی۔ کل بیس ہوگی۔ فاروق اُس کا بیٹا دس سال کا تھا۔ وہ خود

نشیب، ۲۰۱

چالیس سال کو پہنچ چکا تھا۔ تیس سال پہلے وہ دس سال کا تھا۔ اُس کا باپ چالیس سال کا تھا۔ خیال کے اس نقطے کی گردش کے اندر ان متوازن عناصر کا ایک جا ہو جانا ایک سحر کے مانند تھا جو کچھ دیر کے لیے اس کے اوپر طاری ہو گیا۔ اُس کی گود میں پڑے ہوئے کاغذات اور اُن پر تحریر داستان اور سامنے بیٹھی ہوئی اُس کی بیوی، سب کچھ اُس کے دماغ سے خارج ہو چکا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس نقطے کی گردش کا ایک محور ہے جس میں ایک ایسی قوت ہے کہ وہ بے ساختہ اُس کی جانب کھنچا چلا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اُس پر یہ بات کھلی کہ یہ محور اُس کا شہر تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے، بغیر سوچے آفتاب نے اپنے دل میں یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اپنی بیوی سے بات کی۔ اُس کی بیوی کو اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خود تو بیٹھے بیٹھے تیار ہو گیا تھا، مگر اس گہری میں فاروق کا ہمراہ جانا کیوں ضروری تھا۔ مگر پھر وہ اس خیال سے خاموش ہو گئی کہ وہاں پر آفتاب کے ماں باپ کی قبریں تھیں اور وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ آفتاب نے اپنے اسسٹنٹ کو بلا بھیجا، اور بیس جُون کی عدالتی حاضریوں کے بارے میں ہدایات دیں۔ فاروق کو اُس نے اپنا شہر دکھانے، اور وہاں پہنچ کر ایک بڑی دلچسپ کہانی سنانے کا وعدہ کر کے تیار کر لیا۔ رات بھر وہ ٹھیک سے سونہ سکا۔ اُس کا دماغ اُس نقطے پر مرکوز رہا، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ جیسے رات گزرتی گئی اُس کے دل میں یہ خیال پکا ہونا گیا کہ یہ نقطہ ایک راز کا حامل ہے، اور ہونہ ہو یہ راز وہ قدیم گہرہ ہے جس نے تیس برس سے اُس کے دماغ کے ایک حصے کو مغجول کر رکھا ہے۔ شاید اُس گہرہ کے کھلنے کا وقت آگیا تھا!

”میں وہاں بیٹھا تھا۔“ فاروق نے بستر پر لیٹے لیٹے کہا۔

”ہنہہ!“

”کُرسی پر۔“

”اچھا؟“ آفتاب نے بے خیالی سے کہا، ”گھومتی ہے؟“

”ہاں۔ گول گول۔“ فاروق ہاتھ اٹھا کر ہوا میں گھماتے ہوئے بولا، ”گول

گول۔ البتہ؟“

”ہول۔“

”کیا وقت ہوا ہے؟“

”چار بجے ہیں۔“

”اب چلیں؟“

بچہ کہانی سننے کے لیے بے تاب تھا۔ ”ہاں“ آفتاب نے کہا، ”چلو

چلیں۔“

عصر میں کچھ وقت رہتا تھا۔ شہر ابھی سُنان پڑا تھا، گو کہیں کہیں پر زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ بازار میں دکانیں کھل رہی تھیں اور کسی کسی حصے میں نر کاڈ کیا جا رہا تھا۔ مگر گاہک ابھی گھروں سے نہ نکلے تھے۔ صرف دکانداروں کے پاس روزمرہ کے بیٹھنے والے دوست احباب اکٹھے جمع ہو رہے تھے۔

سر پر چھانٹا تانے اُس کے سایے کے اندر اندر چلتے ہوئے دونوں باپ بیٹا بازار پہنچ گئے۔ بازار میں پہنچ کر پہلی بار آفتاب کو کچھ چہروں کی پہچان ہوئی۔ مگر یہ پہچان کوئی اصل پہچان نہ تھی، بلکہ ایسی تھی جیسے درختوں یا مکانوں

کی ہوتی ہے۔ یہ دکانداروں کے قدیم چہرے تھے جنہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ سے وہیں بیٹھے ہوئے دیکھتا آیا تھا۔ کچھ کی داڑھیاں سفید ہو چکی تھیں، باقی تقریباً ویسے ہی تھے۔ اُن میں سے کسی نے آفتاب کی طرف توجہ نہ دی۔ آفتاب کالی

عینک اور چھانٹے میں چھپا چھپا بازار سے گزر گیا۔ جس جگہ پہ پہنچ کر ان کو سرکلر روڈ کی جانب مڑنا تھا وہاں کوٹنے پر ٹنڈا کباب والا اپنا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ڈبہ سی دکان کے ٹھہرے پر مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی سی

مستطیل بھٹی پڑی تھی۔ بھٹی میں اُس نے کوئلے بھر دیے تھے مگر ابھی آگ نہیں لگائی تھی۔ ٹنڈا تھڑے پہ بیٹھا ایک میلے سے گیلے چیتھڑے کے ساتھ اپنی پندرہ بیس سلاخیں ایک ایک کر کے صاف کر رہا تھا۔ بھٹی کے پاس ایک میلی سی کٹی بھٹی ہوئی پنکھی پڑی تھی جسے وہ کوئلے دہکانے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ پنکھی کو دیکھ کر آفتاب کو خیال ہوا کہ شاید یہ وہی پنکھی ہو جو بیس برس پہلے اُس کے پاس ہوا کرتی تھی۔ ابھی کچھ دیر میں، آفتاب نے سوچا، اس بھٹی سے دھواں اُٹھنے لگے گا، جس سے پیٹ بھروں کو مھوک بگ جائے گی۔ شام کی نماز سے پہلے ہی یہاں لوگوں کا جمگھٹ پڑ جاتا تھا جو عشاء تک چھٹا نہ تھا۔ مگر جیسے ہی عشاء کی اذان ہوتی ٹنڈا اپنی سلاخوں کو قمیے کی خالی کنالی میں دھو دھا کر ایک طرف رکھ دیتا، بھٹی کو نالی میں انڈیل کر خالی کرتا جہاں راکھ میں ملے ہوئے چند سُرخ کوئلے سوں سوں کر کے بجھ جاتے، اور بھٹی کو اٹھا کر اندر دکان میں جا رکھتا۔ پھر وہ دکان بند کر کے گھر کی راہ لیتا۔ اُس کا بایاں ہاتھ سلا مت تھا اور دایاں کہنی سے ذرا نیچے تک کٹا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنا سارا کام شروع سے آخر تک اکیلا کرتا تھا۔ جب سے آفتاب نے ہوش سنبھالا تھا یہ کب بانی ایک ڈربہ نما دکان میں ایک چھوٹی تختی کے ساتھ کی بھٹی اور اپنے ایک ہاتھ کے ساتھ کام کرنا آ رہا تھا اور شہر بھر میں مشہور تھا۔ آفتاب نے سوچا کہ اگر وہ اپنی عینک اتار کر اُس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اُس سے بات کرے تو وہ ضرور اُس کو پہچان لے گا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کے سارے عرصے میں ہر تیسرے چوتھے روز شام کو آفتاب اُس دکان کے گرد لگے ہوئے جمگھٹ میں جا کھڑا ہوتا تھا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ پھر انتظار کے بعد جب اُس کی باری آتی تھی تو اخباری کاغذ کے اوپر ترختے ہوئے گرم گرم کباب اور پیاز کی تیز چٹنی ہاتھ پر رکھے، زبان کے نیچے سے ابل کر نکلتے ہوئے مھوکے لعاب کو نگلتا ہوا وہ گھر کی طرف دوڑ پڑتا تھا۔ دکان کے پاس سے نکلتے ہوئے

آفتاب نے مڑ کر دیکھا۔ ٹنڈا اسی طرح سینچیں صاف کر رہا تھا۔ چند منٹ کے اندر وہ بازار سے نکل کر سرکلر روڈ پہ پہنچ چکے تھے۔ سڑک پر اب تانگے اور سائیکل سوار نظر آنے لگے تھے، گودھول ابھی اٹھنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دور تک سرکلر روڈ پر چلنے کے بعد دونوں باپ بیٹا سڑک کے ساتھ ساتھ مڑنے کی بجائے سیدھے ایک ایسے راستے پر نکل گئے جو شہر کے وسطی حصے کو جرنیلی سڑک سے ملاتا تھا۔ آدھے میل کا یہ رستہ غیر آباد ہوا کرتا تھا۔ اب یہ پکی سڑک کی شکل اختیار کر چکا تھا جس کے دونوں جانب چھوٹی بڑی فیکٹریاں ہی فیکٹریاں تھیں۔ بیچ بیچ میں بڑی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ آبادی بالکل نئی تھی ان فیکٹریوں اور کوٹھیوں کے ساتھ ساتھ گندے بدبودار پانی کے جوہر پیدا ہو چکے تھے جن کی سطح مچھروں سے سیاہ ہو رہی تھی۔ آفتاب تیز چلتا ہوا اس علاقے سے نکل گیا۔

وہ جرنیلی سڑک پہ چڑھے تو دفعۃً آفتاب کو یوں محسوس ہوا جیسے وقت پلٹ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ اس وقت کے اندر دنیا جوں کی توں قائم تھی اور وہ اس دنیا کا سدا بہار بچہ پھر اس جگہ پہ کھیلنے آیا تھا۔ چہروں اور عمارتوں کو چھوڑ کر اب زمین کی بادی آئی تھی اور زمین اُسی طرح قدیم اور جانی پہچانی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب جہاں تک نظر جاتی تھی وہی شیشم کے درخت کھڑے جھومتے تھے جن کی چھاؤں میں لو کی جلن گھلتی جاتی تھی۔ آفتاب نے چھاتا بند کر کے لپیٹ لیا اور کالی عینک اُتار کر جیب میں ڈال لی۔ اب دھوپ اُس کی آنکھوں کو تکلیف نہ دے رہی تھی۔ سڑک سے اُتر کر کھیتوں کا وہی نقشہ تھا۔ گہروں کی فصل کاٹی جا چکی تھی۔ فصل کی چھوڑی ہوئی ننگی اور خشک زمین اُجاڑ پڑی تھی۔ اس کھردری زمین کی سطح پر بے شمار چوہے کے بلوں کے سیاہ سوراخ تھے۔ ان سوراخوں کے منہ پر تانہ کھودی ہوئی بادامی مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر پڑے تھے جن کے آس پاس کٹی ہوئی فصل کے بچے کھجے خشک

ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ آفتاب کو یاد آیا کہ یہ سوراخ بہت ڈر والے ہونے
تھے کیونکہ ان میں سانپ ہوا کرتے تھے۔ اب اُسے پتا تھا کہ یہ چوہوں کے
بل ہیں مگر ان سوراخوں میں خوف ابھی موجود تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو ان
سوراخوں سے بچ کر چلنے کی ہدایت کی۔ ایک چارے کے کھیت کے کنارے
سے گزرتے ہوئے جھک کر اُس نے فصل کا ایک لمبا سا سبز تپا توڑا اور اسے
دانتوں میں لے کر چبانے لگا۔

ٹنڈ منڈ درخت والے کھیت میں وہ مرا ہوا قدیم درخت اُسی طرح
کھڑا تھا۔ آفتاب اُس سے چند قدم کے فاصلے پر مبہوت کھڑا اُسے دیکھتا
رہا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ درخت اُسی طرح اُس کے سامنے کھڑا
ہے۔ وہ اپنے دل میں سوچتا ہوا آیا تھا کہ درخت والی جگہ شاید اُسے تلاش
کرنی پڑے گی۔ وہ وہاں سے گزرنا چاہتا تھا، وہیں پہرے کمرہ فارق
کو اپنا قصہ سنانا چاہتا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ جھاڑیوں کی ایک لمبی باڑ
کو پار کر کے دوسری طرف نکلا تو سامنے وہ درخت اُسی کا اُسی طرح کھڑا
تھا، جیسے کوئی بُت ہو۔ آفتاب آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس جا
کھڑا ہوا۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے درخت کی ایک تڑی مڑی ہوئی
سیاہ شاخ کو چھوا، گویا اُسے ڈر ہو کہ ہاتھ لگانے سے درخت کا درخت دھڑام سے نیچے
آگرے گا۔ مگر وہ درخت مضبوطی سے اپنی جگہ پر زمین میں گڑا کھڑا رہا۔ اس کا ایک ایک
ریشہ خشک اور مُردہ ہو چکا تھا، مگر اس کی سختی میں، اس کی کرناک تندا ٹھان میں، اس
کی زمین کی جگڑ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کی چھال کی اُکھڑی ہوئی لکیریں تک
وہی تھیں، گویا وہ درخت اپنی موت کے ایک لمحے میں مسخ ہو کر ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے زمین کا ایک نشان بن گیا ہو۔ صرف اُس سے چند گز کے
فاصلے پر شیشم کا ایک مہیب درخت نمودار ہو چکا تھا۔ آفتاب کو یہ

درخت یاد نہیں تھا۔ بیس سال پہلے کے واقعے کے بعد اس کا ادھر آنا چھوٹ گیا تھا۔ اُس کی ماں نے زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ پھر جب آفتاب جو ان ہوا تھا تو چند بار اُس کا ادھر آنا ہوا تھا۔ مگر اُس وقت تک ڈسٹرکٹ بورڈ کی ایک کچی سڑک بن گئی تھی جو ان کے کنوئیں کے پاس سے نکلتی ہوئی احمد پور شریف تک جاتی تھی۔ وہ سائیکل پر اُس سڑک سے آیا جایا کرتا تھا۔ آفتاب نے سر اٹھا کر شیشم کے گھنے درخت کی شاخوں میں دیکھا۔

”ابو میں تھک گیا ہوں۔“ فاروق نے اپنے باپ سے کہا۔

آفتاب نے رد مال نکال کر اپنے بیٹے کا چہرہ خشک کیا۔ ”بس اب تھوڑی دُور رہ گیا ہے۔“ وہ فاروق کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا، ”وہ دیکھو سامنے دکھائی دے رہا ہے۔“

”کہاں؟“

آفتاب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”وہ درختوں کا جھنڈ دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”اُس کے اندر کنواں ہے۔“ وہ بولا، ”اُس کے ارد گرد کھیت ہیں۔ یہ ہماری زمین تھی۔“

”ابو۔“ فاروق نے کہا، ”میں نہیں جانتا۔ میں تھک گیا

ہوں۔“

”وہاں بڑی اچھی چھاؤں ہوگی۔“ آفتاب بولا، ”یہ سامنے ہی

تو ہے۔“

”او مہنک!“ بچہ ٹھنک کر بولا، ”مجھے دھوپ لگ رہی ہے۔“

میں نہیں جانتا۔“ وہ جا کر شیشم کے نیچے بیٹھ گیا۔

آفتاب نے ایک طویل نظر اُس مانوس سیاہ جھنڈ پہ ڈالی جو سامنے دو فرلانگ کے فاصلے پر وہیں موجود تھا۔ جلتی ہوئی دھوپ میں

کھڑے کھڑے آفتاب نے اپنے گالوں پہ اُس جھنڈ کی ٹھنڈی چھاؤں کو محسوس کیا۔ اور اُس نے محسوس کیا چھاؤں کا یہ لمس اتنا مانوس تھا اور اتنے قریب سے آیا تھا کہ گویا اس بات کو بھی بیس دن بھی نہ گزرے ہوں جب وہ ان درختوں کے سائے میں بیٹھا ستا رہا تھا۔ اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں جا کر ٹھنڈی لسی کا بھرا ہوا کٹورہ پیے اب یہاں پر کون لوگ رہتے ہوں گے؟ آفتاب نے حیرت سے سوچا۔

”ابو واپس چلیں۔“ اُس کے بیٹے نے کہا۔

چھاؤں کا وہ جھونکا پاک جھپکنے میں گزر گیا۔ آفتاب جا کر اپنے بیٹے کے پاس شیشم کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”ذرا دم لے کر چلتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ابو کہانی کب سنائیں گے۔“ فاروق اکتائے ہوئے لہجے میں بولا، جیسے صبر کر کے تھک گیا ہو۔

آفتاب نے نظر اٹھا کر دُھوپ میں دور دور تک دیکھا۔ سامنے وہ ننگا درخت اپنی ٹیڑھی میڑھی شکل لیے بے جنبش کھڑا تھا، جیسے کسی ڈراؤنے خواب کی شکل ہو۔ آفتاب نے جیب سے کالی عینک نکال کر آنکھوں پر لگا لی۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو کہانی سنانے لگا۔

دھیمی، ٹھہری ہوئی آواز میں آفتاب نے اپنے بیٹے کو تیس سال پہلے کا وہ قصہ سنایا جس نے اس کی زندگی کو جھکڑ کے رکھ دیا تھا۔ گویہ قصہ اول سے آخر تک جوں کا توں محفوظ تھا، مگر شروع شروع میں آفتاب کو بولنے میں دقت محسوس ہوئی۔ اُسے ایسا لگا کہ جیسے کوئی شے زمین میں گہری دفن ہے اور وہ کھود کھود کر اُسے نکال رہا ہے۔ کچھ دیر تک وہ رُک رُک کر بولتا رہا، جیسے واقعات کو چُن چُن کر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھتا جا رہا ہو مگر کوئی کٹری نہ ملتی ہو۔ پھر گویا اس کی آواز سے واقعات کے ان تنکوں میں

جان پڑنے لگی۔ جیسے جیسے وہ بولتا گیا یہ پتلی پتلی لکیریں زمین پر پڑی پڑی سر
سرا نے لگیں اور پھر ایک دوسری کے گرد گنڈل مالد کر زنجیر کی شکل بنتی گئیں۔
آہستہ آہستہ آفتاب اس زنجیر میں بندھتا گیا اور اس کے خیال میں روانی
آتی گئی۔ اُس نے الفاظ کو اپنے منہ سے ننھے ننھے تیز پد پدوں کی مانند پھر
سے اڑ کر نکلتے ہوئے اور آواز کے رستے انہیں وقت کے ایک نقطے میں گم
ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس پیش آلود دوپہر میں درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے آفتاب
نے اپنی عمر کی طویل اندھی سڑنگ کو سکڑتے ہوئے دیکھا حتیٰ کہ دُور سے
اُس کا روشن سرا اُس کی آنکھوں کے قریب آکر رُک گیا اور اُس نے ایک ایک
بات کو، ایک ایک لمحے کو اپنی جلد کے اوپر سرسراتے ہوئے اس طرح محسوس
کیا جیسے تیس برس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ جیسے وقت کی اور عمر کی اور
آدمی کے بدن تک کی کوئی حقیقت نہ ہو بلکہ صرف ایک شے پر دنیا کا
وجود قائم ہو اور وہ آدمی کے دل کی یاد ہو جو نسل در نسل دنیا کو باندھتی
ہو۔ اُس نے زمین سے نظر اٹھا کر اپنے بیٹے کے منہمک چہرے کو دیکھا اور
ہاتھ بڑھا کر اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا، جیسے زنجیر کا سرا اُس
کو منتقل کر رہا ہو۔ وہ اپنی کہانی کے اختتام کو پہنچا تھا۔

اس کہانی میں آفتاب نے صرف ایک بات کی تبدیلی کی تھی۔ اُس نے
یہ نہیں بتایا کہ جس شخص کے ساتھ وہ تیس برس پہلے آج کے روز شہر سے
باہر گھومنے کو گیا تھا اور جس نے گھر واپس آکر کچھ کہے سنے اور ظاہر کیے بغیر
اپنے آپ کو بندوق مار لی تھی وہ اُس کا باپ تھا۔ یہ بات بتانے کی اُسے
ہمت نہ ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شخص ان کا ایک ہمسایہ تھا۔

کہانی ختم کر کے وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ واپسی پر دھوپ میں
چلتے ہوئے آفتاب نے نہ کالی عینک نکال کر لگاتی نہ چھاتا کھولا۔ وہ سورج
کی پیش سے بے نیاز ہو کر چلا جا رہا تھا۔ اس کا دل خالی ہو چکا تھا، مگر اُس

کا جسم ہلکا پھلکا اور مضبوط تھا۔ اُس کے ذہن میں اس وقت کوئی سوچ نہ تھی، مگر اُس کے بدن میں یہ ایک احساس تھا کہ اُس کے لڑکپن کا یہ شہر اُس کا شہر تھا، یہ کھیت اور یہ درخت، یہ سڑکیں جن پر اب تانگے اور موٹر میں دھول اڑ رہی تھیں اور بازار جن میں اب تلفی اور فالو دے کی ریڑھیاں سجی تھیں اور موتیے کے ہار بیچنے والے نکل آئے تھے، یہ گلیاں جن میں عورتیں اپنے دروازوں کے بیچ دہلیزوں اور گھڑوں پر بیٹھی پنکھیاں جھل رہی تھیں اور گرمی سے مرنے لگی تھیں لپٹی ہوئی باتیں کر رہی تھیں اور بچے گرمی سے بے پروامی میں گرتے پڑتے ہوئے کھیل رہے تھے، یہ گھر جن کے اندر کورے گھڑوں اور لوہے کے ٹھنڈے کٹوروں کے بچنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کسی کسی صحن سے لسن اور پیاز کے بگھار کی تیز خوشبو نکل کر چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی — آفتاب کے بدن میں یہ ایک امنٹ احساس تھا کہ یہ ساری جگہیں اس کی جگہیں تھیں۔ بیس برس ہوئے وہ اپنا شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر ان بیس برسوں میں جہاں جہاں بھی وہ رہا تھا، لاہور میں جہاں اُس کا مکان تھا اور ان شہروں میں جہاں کام کی خاطر اُس نے کچھ وقت گزارا تھا اور دوسری جگہوں میں جہاں سفر کرتے ہوئے اُس کا گزارا ہوا تھا یہ کیفیت کبھی اُس پر طاری نہ ہوئی تھی جو اب اُس پر تھی، یہ کیفیت جو بدن کی بے خبری کی کیفیت تھی۔ بیس برس تک اُس کا دل شل رہا تھا مگر بدن ایک ایک لمحہ ایک بے نام اور بے نشان ڈر سے پھٹتا رہا تھا، جیسے کسی آن کوئی عقب سے جھپٹ کر دبوچ لے گا۔ اب یہاں جسم بے بوجھ تھا اور پیٹھے آرام سے پڑے سستاتے تھے جیسے اُن کو اپنی کوئی خبر نہ ہو صرف دل ایک باخبر جگہ تھی۔ پہلی بار زندگی میں آفتاب کو علم ہوا کہ وہ دو لفظ جو بار بار اُس نے لوگوں کی زبانی سُنے تھے، ”میرا شہر“، ان دو لفظوں کے اصل معنی کیا تھے۔

ہوٹل کے آگے ایک مختصر سے باغیچے میں آفتاب اور فاروق آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے کوکا کولا پی رہے تھے۔ بوتلیں میز پر رکھی تھیں۔ برف کی لگی ہوئی بوتلوں پر دونوں باپ بیٹے کی انگلیوں کے نشان تھے۔ ان نشانوں سے اوپر شیشے پر انجماد کی جھلی اب ترخنے لگی تھی۔ اس کی صاف تنی ہوئی سطح پر جگہ جگہ گنجل پڑ چکے تھے جو پانی کے ننھے ننھے قطروں کی شکل میں ڈھلک ڈھلک کر ٹرے ٹرے راستے بناتے جا رہے تھے۔ شام پڑ رہی تھی۔ باغیچے کے گرد گہر دین تین فٹ کی دیوار تھی جس کے پرے سڑک پر تانگوں، موٹر وول اور پیدل چلنے والوں کا دوسرا دیلا شروع ہو رہا تھا۔ رات کی گاڑیوں کا وقت ہونے والا تھا اور تانگے والے سٹیشن کی ہانک لگا رہے تھے۔ شام کی سیر کے لیے لوگ نہادھو کر بالوں میں کنگھی کیے، سفید ٹل کے کرتے پہنے سڑک پر آنکلتے تھے۔ فاروق اٹھ کر دیوار کے قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اُس نے کرسی سے ٹیک لگالی اور ٹانگیں باغیچے کی دیوار پر رکھ کر اپنا کومک پڑھنے لگا۔ چند منٹ کے بعد آفتاب نے اپنی بوتل اٹھائی اور فاروق کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھا۔

”کہانی اچھی لگی؟“ آفتاب نے پہلی بار اپنے بیٹے سے پوچھا۔
 فاروق نے حلق سے سُنی نہ سُنی کی بے معلوم سی آواز نکالی اور گھٹتے ہوئے اُجالے میں کومک پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوٹل کے برآمدے میں ایک چھوٹا سا ننگا بلب جل رہا تھا جس کی ناکافی روشنی ان تک پہنچ رہی تھی۔ آخر فاروق نے تھک کر نظر کومک سے اٹھالی۔

”ابو،“ اُس نے اچانک پوچھا، ”آپ یہ کہانی لکھیں گے؟“

”شاید لکھوں،“ کچھ دیر بعد کہہ کر آفتاب نے جواب دیا۔

”ابو،“ فاروق پھر بولا، ”اگر آپ کہانیاں نہ لکھیں تو سب سے بڑے وکیل

من جائیں؟“

نشیب ، ۲۱۱

آفتاب ہنس پڑا۔ ”یہ تم سے کس نے کہا ہے۔“
”امی نے۔“

”کیا کہتی ہیں۔“
”کہتی ہیں اگر ابو کہانیاں لکھنے میں وقت ضائع نہ کریں تو سب سے بڑے
وکیل بن جائیں۔“
آفتاب ہنس کر خاموش ہو رہا۔

”فاروق۔“ آخر آفتاب نے کہنیاں میز پر رکھ کر اپنے بیٹے کو مخاطب کیا،
”میں یہ کہانی لکھوں؟“

فاروق نے پھر عدم دلچسپی کی ننھی سی آواز نکالی اور سٹرک کو دیکھتا رہا۔
”پھر ایک بات بتاؤ۔“ آفتاب نے بات جاری رکھی۔
”کیا۔“

”انہوں نے اپنے آپ کو بند وق کیوں مار لی تھی۔“
”پتا نہیں۔“

”نہیں بھئی، سوچ کر بتاؤ۔“ آفتاب نے اصرار کیا۔ ”تم بتاؤ گے تو پھر کہانی
لکھوں گا۔“
”کیوں۔“

”مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی۔“

فاروق چند سیکنڈ تک حیرانی سے اپنے باپ کے چہرے کو دیکھتا رہا،
پھر ہولے سے مڑے موڑ کر سٹرک کو دیکھنے لگا، جیسے سوچ میں ہو۔ کچھ دیر تک دونوں
باپ بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے۔ آفتاب کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔
اُس نے اپنا بوجھ کہنیوں پہ ڈالا اور میز پر جھک گیا۔ اُس کے بدن کا خدشہ
لوٹ کر آ رہا تھا۔

اچانک فاروق نے پلٹ کر اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

بچے کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”شاید انہیں گھوڑے اچھے لگتے تھے۔“ وہ بولا۔

آفتاب کی نظروں کے سامنے کی دُھند چھٹنے لگی۔ روشنی کا ایک مہین سا نقطہ اُس دُھند میں پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اُس شفاف دائرے کے اندر ایک نقرہ بنج پاتھا۔ سورج کی روشنی اُس کے سفید بدن پر اس تیزی سے چمک رہی تھی کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی، اور تنے ہوئے جسم کا ایک ایک پٹھ نمایاں تھا، جیسے پتھر سے کاٹا گیا ہو۔ گھوڑے کی لُپٹ پر ایک شہسوار اس کی باگیں تھامے جم کر بیٹھا تھا۔ سوار انگریزی فوج کے سپاہیوں کی سفید وردی اور ہیٹ پہنے تھا اور اُس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی جو آسمان کی جانب اُٹھی ہوئی تھی۔ گھوڑا اور سوار اس طور ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جیسے ایک بدن ہوں اور ایک ٹاپ میں زمین کو پھیلا ننگ جابتیں گے۔ شام کے اندھیرے میں آفتاب کہنیوں کے بل جھکا آنکھیں پھیلائے اس حُسن اور توازن کی چمک دیکھ کر تصویر کو دیکھتا رہا، حتیٰ کہ دُھند کا حلقہ پھر اس کی نظر کے گرد ننگ ہونے لگا۔ یہ منظر جس تیزی سے ظاہر ہوا تھا اُسی تیزی سے غائب ہو گیا۔ مگر اس منظر کے ایک لمحے میں آفتاب کو اس بات کا علم ہوا کہ یہ اُس کے باپ کی زندگی کا لغیس ترین لمحہ تھا۔

رات پڑ رہی تھی۔ ایک لحظے کی چمک اب گزر چکی تھی۔ اس اندھیرے میں اب ایک بات اور اُس کے مقابل آنکھری ہوتی تھی۔ وہ شفاف لمحہ اپنے چھپے اپنا سا پہ چھوڑ گیا تھا، گویا ایک بات ظاہر ہو گئی ہو اور ایک پوشیدہ! یہ شہر آفتاب سوچ رہا تھا، جہاں میرے باپ نے اپنی عمر گزاری تھی، اُس کے دل سے اُتر گیا تھا۔ اور میں جو اس شہر کو چھوڑ گیا تھا یہاں آکر دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ یہ کیا بات تھی؟ — اُس کے دل کی الجھن دور ہو گئی تھی تاہم وہیں یہ موجود تھی۔ صرف ایک بات کا اسے قطعی طور پر علم تھا، کہ

وہ اس شہر کا باسی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اب رات پڑ گئی تھی۔ سڑک کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ سامنے والے کھجے کے بلب کی روشنی باغیچے میں پڑ رہی تھی۔ اُس مدھم روشنی میں فاروق ٹانگیں دیوار پر رکھے پھر اپنے کومک کے ورق الٹ رہا تھا۔

”ابو۔“ اچانک فاروق بولا، ”میں بڑا ہو کر امریکہ جاؤں گا۔“

آفتاب نے چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ بچے کی آنکھوں میں چمک تھی۔

آفتاب آنکھیں پھیلاتے اُسے دیکھتا رہا۔

”اچھا۔“ اُس نے بے خیالی سے کہا۔

”میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور امریکہ جاؤں گا۔“ بچے نے کہا۔

اُس کی گود میں کومک کھلا پڑا تھا جس کے صفحے پر ایک دیو قامت سیاہ آدمی ایک چوڑی سی سڑک پار کر رہا تھا اور اُس کے پاؤں کے ارد گرد لمبی لمبی کاریں آج رہی تھیں۔ فاروق منہ موڑ کر سڑک کو دیکھنے لگا تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں ایک دُور کی جھلک تھی۔

کچھ دیر کے بعد آفتاب کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، جیسے کوئی بات کرنے والا ہو، پھر اُسے وہیں چھوڑ کر ہوٹل کی عمارت کے اندر چلا گیا۔ ہوٹل کے مال میں چند لمحے تک رُک کر وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

چند منٹ کے بعد جب فاروق نے جا کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر اندھیرا تھا۔ اُس نے اُچک کر بتی جلا دی۔ اُس کا باپ اُسی طرح کپڑے اور بوٹ جرابیں پہنے اپنی چار پاتی پر سیدھا لیٹا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے آرام سے اُس کے سینے پر رکھے تھے اور اُس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ کمرے میں سخت گرمی تھی۔

”ابو—“ فاروق بولا، ”پکھا چلا دُوں؟“
 آفتاب کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ فاروق چل کر اُس کے پاس جا
 کھڑا ہوا۔

”ابو—“ اُس نے آہستہ سے پکارا۔
 آفتاب نے آنکھیں کھول دیں اور چھت کو گھورنے لگا، گویا پہچاننے
 کی کوشش کر رہا ہو۔

”چلا دو۔“ اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”ابو مجھے مہجھو ک لگی ہے۔“

آفتاب اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے غسل خانے میں جا کر منہ پہ ٹھنڈے
 پانی کے چھینٹے مارے اور تو لیے سے چہرہ خشک کیا۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو
 لے کر کمرے سے نکل گیا۔

”ابو واپس کب جائیں گے؟“ فاروق نے پوچھا۔

”صبح سویرے۔“

وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔



نشیب

(ناولٹ)

میں ہر ماہ ایاز سے ملاقات کے لیے لاہور جاتا رہتا ہوں۔ اس مرتبہ گیا تو باتوں باتوں میں ایاز نے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا جس نے مجھے کئی برس پہلے کا گذرا ہوا وقت یاد دلایا۔ میں کل ہی لاہور سے واپس آیا ہوں، اور اس واقعے کی ایک ایک بات ابھی تک گویا میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ یہ واقعہ میری اور ایاز کی زندگی کے تانے میں اس طرح بنا ہوا ہے کہ اسے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔

ایاز بیگ میرا بچپن کا دوست ہے۔ جس وقت کی یہ بات ہے اس وقت وہ لاہور کا ایک اہم نوجوان وکیل تھا۔ حال ہی میں اس نے دو مشہور مقدمے لڑے تھے۔ پہلا قتل کا مقدمہ تھا جس میں ایک بڑے زمیندار کے بیٹے نے کسی تنازعے پر ایک کاشت کار کو ہلاک کر دیا تھا۔ دوسرا سیاسی نوعیت کا مقدمہ تھا، جس میں اغوا و رشوت تشدد وغیرہ سب شامل تھے۔ ان مقدمات میں چونکہ بڑے بڑے بااثر لوگ ملوث تھے اس لیے اخبارات میں ان کی خوب تشہیر ہوئی تھی۔ ہفتوں تک اوراق کے اوراق عدالتی کارروائی سے سیاہ ہوتے رہے۔ ایاز ایک مقدمہ جیت گیا اور دوسرا ہار گیا تھا۔ مگر اس کی شہرت کی اصل بنیاد اس کی انسان دوستی پر تھی۔ یہ مقدمے اس نے غریب اور بے اثر فریق کی حمایت میں لڑے تھے۔ ان دنوں شہر کے پڑھے لکھے نوجوان طبقے میں ایاز ایک ایسے شخص کی حیثیت سے شہرت حاصل کرتا جا رہا تھا جس نے بدعنوانی اور بالادستی کے خلاف ہتھیار اٹھا رکھے ہوں۔ اس کے دشمنوں کا کہنا تھا کہ اسکے اس انداز میں تمام تر انسان دوستی کے جذبات ہی کارفرما نہیں بلکہ اس کی سیاسی امنگوں کا عمل دخل بھی تھا، جن کے حصول کی خاطر وہ نہایت ہوشیار سی سے رستہ ہموار کر رہا تھا۔ میرے ساتھ بات چیت میں اگرچہ ایاز نے کبھی ایسی بات کی جانب اشارہ نہیں کیا تھا مگر مجھے احساس تھا کہ اگر مستقبل میں کسی وقت سیاست کا دروازہ

اس پہ کھل گیا تو وہ سیاسی عمل میں اسی جوش و خروش سے کود پڑے گا جس سے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام تر کام کرنا آتا تھا۔

ہم دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے۔ ہم ایک ہی محلے میں پل کر بڑے ہوئے اور ایک ہی پرائمری اور ہائی سکول میں تعلیم پانے کے بعد اپنے شہر کے انٹر میڈیٹ کالج میں داخل ہوئے تھے۔ ایاز کی طالب علمی کا زمانہ عجیب طرح سے دھکے کھا کھا کر آگے بڑھا۔ پانچویں جماعت تک وہ کلاس کا سب سے مالالتق لڑکا تھا۔ اس کو نہ پڑھنا سکھنا آتا تھا نہ بچے نہ پہاڑے۔ کبھی اس نے گھر کا کام نہ کیا تھا۔ سرور کلاس میں اسے مار پڑا کرتی تھی۔ مگر جونہی ہم نے پانچویں جماعت پاس کی اور سکول بدل کر بڑے سکول میں پہنچے، یوں معلوم ہوا جیسے ایاز کو پر لگ گئے ہوں۔ کہاں وہ کلاس میں سب سے پیچھے گھسٹا چلا آ رہا تھا، کہاں اب وہ سال کے اندر اندر چوٹی کے لڑکوں تک پہنچ گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی ہیبت بدل گئی۔ اس کے لباس میں صفائی اور ترتیب آگئی۔ اس کے بال کنگھا کیے اور جوتے پالش سے چمکتے ہوئے ہوتے۔ ہم لوگ اس وقت دس گیارہ برس کے تھے، اور اس عمر میں بچے صرف ایک دوسرے کی جسمانی قوت سے مرعوب ہوتے ہیں۔ تمام کلاس کے سب لڑکے ایاز کی اس آناً فاناً تبدیلی پر حیران تھے۔ ایاز کی ترقی کی رفتار اگلے تین سال تک اسی طرح قائم رہی۔ جب ہم نویں جماعت میں تھے تو اس کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی افتخار کو جو اسی سال میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوا تھا، پڑھائی چھوڑ کر اپنے باپ کی چھوٹی سی کپڑے کی دکان سنبھالنا پڑی۔ ان کے باپ نے اپنے دونوں بیٹوں کو کبھی دکان کے کام میں نہیں لگایا تھا، یہاں تک کہ وہ ان کو دیر تک وہاں رکھنے بھی نہ دیتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے تعلیم حاصل کر کے سرکاری نوکری کریں۔ جب افتخار نے دکان پر بیٹھنا شروع کیا تو اسے اس کا روبرو کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ چنانچہ ان کی آمدنی دن بدن کم ہونے لگی۔ اسی دوران میں ایاز نے اپنی پڑھائی سے لاپرواہی برتنا شروع کر دی۔ کلاس میں اس کی پوزیشن پھسلنے لگی، اور استاد اس کے بارے میں فکر مند نظر آنے لگے۔ اُس سال

کی گرمیوں کی چھٹیاں مجھے بھی طرح سے یاد ہیں، کیونکہ وہ ساری چھٹیاں میں نے افتخارہ اور ایازہ کے ساتھ ان کی دکان پر گزاری تھیں۔ ایازہ باتقاعدگی سے صبح اپنے بھائی کے ساتھ دکان پر چلا جاتا۔ میں بھی پڑھنے کا بہانہ کر کے کتابیں کاپیاں لے کر صبح ہی صبح ان کی دکان پر پہنچ جاتا۔ پھر ہم تینوں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ کبھی کبھار کوئی دیہاتی منڈی میں جنس بیچ کر یا کچھری میں کوئی مقدمہ بھگت کر واپس جاتا ہوا دکان خالی دیکھ کر اندر چلا آتا، اور دو چار گز چھنیٹ یا کورا لٹھا خرید کر چلا جاتا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں مجھے صرف ایک منظر کے حوالے سے یاد ہیں، گویا اس سارے موسم کا پنچوڑا اس ایک جھلک میں ہے۔ یہ منظر اس چھوٹی سی کپڑے کی دکان کا ہے جس کے خانے کپڑے کے تھانوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور کوئی اس دکان میں نہیں آتا، صرف ہم تین لڑکے اندر میلے پھول دار کپڑے کے نمونے پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ جب سہ پہر کے وقت پیش بڑھ جاتی تو افتخار اٹھ کر دکان کا سائبان نیچا کر دیتا اور چہرہ رومال سے ڈھک کر، سرگاوٹیکے پہ رکھ کر آنکھیں موند لیتا اور سوتے جا گتے میں بازو ہلا ہلا کر کاٹتی ہوئی مکھیوں کو اڑاتا رہتا۔ میں اپنی کاپی اور کتاب کھول کر سکول کا کام ختم کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔ اُن کی دکان کے بغل میں رسالوں اور کرایے کے ناولوں کی ایک دکان تھی۔ ایازہ وہاں سے کوئی ناول مفت مانگ کر لے آتا اور اسے پڑھتا رہتا۔ ان چھٹیوں میں ایازہ نے ”سودائی“ اور ”سرجانی“ نام کے دو ناول چارہ پانچ پانچ مرتبہ پڑھ ڈالے۔ اس بات کو ایک زمانہ ہو گیا ہے مگر آج بھی مجھے ان ناولوں کی کہانیاں، جو ایازہ نے سنائی تھیں، یاد ہیں۔ سکول کا کام کرتے ہوئے جب مجھے کوئی وقت پیش آتی تو میں ایازہ سے پوچھ لیتا۔ اکثر اوقات وہ میری کتاب یا کاپی وغیرہ دیکھے بغیر ہی صرف سوال سن کر اس کا جواب یا حل کرنے کا طریقہ زبانی مجھے بتا دیتا۔ پھر وہ اپنا ناول پڑھنے لگتا۔ چھٹیوں بھر اس نے سکول کی کتاب کو کھول کر نہیں دیکھا، جیسے اس کو کوئی پروا نہ ہو۔ سکول کھلنے پر اس نے سب ماسٹروں سے یہ کہہ دیا کہ اس کے کام والی تمام کاپیاں ایک روز پہلے دکان پہ رکھی تھیں کہ کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔ اس روز وہ ہیڈ ماسٹر کے سامنے اس کی پیشی ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر کے سامنے صرف لڑائی

اور مار پیٹ پر پیشی ہوا کرتی تھی۔ یہ پہلی بار تھی کہ کلاس کے ماسٹروں نے پڑھائی کے بارے میں کسی لڑکے کی پیشی کرانی تھی۔ ہم سب کی نظریں ہیڈ ماسٹر کے دفتر پر لگی ہوئی تھیں اور ہمارے چھوٹے چھوٹے دماغوں میں مبالغہ آمیز خیالات چلے آ رہے تھے۔ جماعت کے معتبر لڑکوں کی رائے یہ تھی کہ ایازہ کو سکول سے نکال دیا جائے گا۔ مگر جب ایازہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے سے نکل کر آیا تو اُسی کا اُسی طرح تھا۔ اس کی شکل و صورت سے کسی قسم کی سزا کے آثار ظاہر نہ تھے۔ وہ آکر کلاس میں بیٹھ گیا اور پڑھائی شروع ہو گئی۔ چھٹی کے وقت جب ہم نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر نے اسے نہ مارا ہے نہ پیٹا ہے بلکہ اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا ہے کہ اسے اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دینی چاہیے، کیونکہ اگر وہ محنت کرے تو سکول کا بہترین طالب علم ہو سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ہیڈ ماسٹر کی پیشی کے باوجود ایازہ کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اب اس نے سکول سے غیر حاضریاں بھی کرنی شروع کر دیں۔ اس کی ماں نے محلے والوں کے کپڑے وغیرہ سینے کا کام شروع کر دیا تھا، چنانچہ وہ شام کو اپنی ماں کے ساتھ، یا کبھی اکیلا، کپڑے ادھر ادھرے جایا اور لایا کرتا تھا۔ دن کو وہ اکثر اپنے بھائی کے پاس دکان پر بیٹھا رہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال کے آخر میں وہ پاس تو ہو گیا مگر مشکل سے۔ کلاس کے آخری لڑکوں میں اس کا نمبر آیا۔

دسویں جماعت کے دو مہینے گزر چکے تھے اور گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں کہ ایازہ میں ایک بار پھر اچانک تبدیلی رونما ہوئی۔ اس نے باقاعدگی سے سکول آنا اور سکول کا کام کرنا شروع کر دیا۔ چھٹیوں کے دوران میں کئی بار ان کی دکان پر گیا، مگر اب ایازہ نے دکان پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی دکان سے میں ان کے گھر جاتا تو ایازہ کو گھر کی چھوٹی سی بیٹھک میں پڑھائی کرتے ہوئے پاتا۔ اس نے باہر آنا جانا کھینا کودنا وغیرہ بند کر دیا تھا، یہاں تک کہ کئی بار میں گھنٹوں تک اس کے پاس بیٹھا رہتا اور وہ میری باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتا ہوا پڑھائی میں مشغول رہتا۔ اس کے بھائی افتخار کو اب دکان کے کام کا کچھ تجربہ ہو چلا تھا، چنانچہ ان کی آمدنی